خطبہ ۴: تاریخ اصولِ فقہ واجتہاد

محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ! محترم مہمانان گرامی!

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ!

آج کا موضوع اصولِ فقہ کے متعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مقابلتاً ایک ٹیکنیکل مضمون ہونے کی وجہ سے کم دلچسپ ہو گا۔ لیکن جیسا کہ آپ ابھی ملاحظہ فرمائیں گے یہ وہ موضوع ہے جس پر مسلمان بجاطو پر فخر کر سکتے ہیں۔ دنیا کی تاریخِ قانون میں مختلف قوموں نے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا کارنامہ غالباً اصولِ فقہ ہے۔ مسلمانوں سے پہلے بھی دنیا میں قانون موجود تھا لیکن اصول فقہ جیسی چیز دنیا میں کہیں نہیں ملتی اور آج بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک امتیازی اضافہ ہے، جس کی بدولت علمِ قانون کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔ آپ سب واقف ہیں کہ قانون دنیا کی ہر قوم میں ملتا ہے۔ یہ قانون دو قسم کے رہے ہیں۔ انتہائی تاریک زمانوں سے لیکر آج تک اول تو بن لکھا قانون ہمیں ہر جگہ ملتا ہے یعنی رسم ورواج، جو ہر ایک ملک میں پایا جاتا ہے، جس کا مؤلف یا قانون ساز ہمیں معلوم نہیں ہوتا لیکن اس پر سب لوگ عمل کرتے ہیں۔ دوسرا قانون وہ ہوتا ہے جو کسی بادشاہ یا کسی حکمران کی طرف سے مدون کر کے نافذ کیا جاتا ہے اور بالعموم تحریری صورت میں ہمیں ملتا ہے۔ بہر حال انسان اپنی فطرت کے بنیادی تقاضوں کے پیش نظر اپنی خواہش سے اپنے لیے کوئی قانون بنا کر اس پر عمل کرتا ہے۔ لہذا قانون ہر انسانی معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہے۔

جہاں تک تحریری قانون کا تعلق ہے، غالباً قدیم ترین قانون جو ہم تک پہنچا ہے وہ حمورابی بادشاہ کا ہے۔ یہ عراق کا بادشاہ تھا اور جدید ترین مغربی تحقیقات کے مطابق یہ وہی شخص ہے جسے ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کہا جاتا ہے۔ اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ ان

دونوں کازمانہ ایک ہے (اٹھارہ سوپچاس برس قبل مسیح)اور ملک بھی ایک ہی ہے۔حمورابی کا قانون ہم تک تحریری صورت میں پہنچاہے۔ایران میں سوس نامی مقام پر کچھ۔عرصہ قبل کھدائیوں میں ایک سیاہ رنگ کاپتھر ملاجس پر دوآدمیوں کی سی شکلیں ہیں۔جن میں سے ایک خداہے اوردوسراحکمران حمورابی،جو خدا سے احکام حاصل کر رہاہے۔یہ پتھر ستون کی شکل میں ہے جس پر قانون میخی رسم الخط میں کندہ کیاگیاہے۔اسے مغربی ماہرین نے اب پڑھ لیاہے۔اوراس کے ترجمے بھی دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔یہ قدیم ترین تحریری قانون ہونے کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ بہترین قانون بھی ہے۔ایک مثال میں آپ کودیتاہوں۔ اس قانون کی دفعات ومندرجات میں سے ایک قانون یہ ہے،جسے سب لوگ قبول کریں گے کہ قصاص لیناچاہیے۔مثلاًمیں کسی کو قتل کروں توسزائے موت دی جائے۔اس بنیادی اصول کو حمورابی بادشاہ کے مشیروں نے ترقی دے کر مضحکہ خیز حد تک پہنچادیاہے۔چنانچہ اس میں لکھاہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی گائے کو قتل کر دے تواس قاتل کی گائے کو قتل کیاجائے۔ممکن ہے آپ اسے قبول کرلیں۔میں یہ کہوں گا کہ بجائے اس کے کہ گائے کو قتل کرکے ضائع کریں کیوں نہ اس محروم شدہ شخص کوصلہ دیاجائے جس کی گائے ماڑالی گئی۔خیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ گائے کے بدلے گائے۔اس کے بعد لکھاہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیٹی کو قتل کرے تو قاتل کی بیٹی کو قتل کیاجائے۔بھلااس بیچاری کاکیاقصور تھا۔یہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ بجائے اس کے کہ اس کے قاتل کوسزادی جائے قاتل کی بیٹی کوکیوں سزادی گئی۔یہ ادلے کابدلہ(Tittat for)اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ قصاص کے اس اصول کو حمورابی کے ہاں بے سمجھی سے گویاانتہاتک پہنچادیاگیا۔انصاف کے اس اصول کو آج ہماری عقل سلیم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی لیکن اب سے چار ہزار سال پہلے کے لوگ سمجھتے تھے کہ یہی انصاف ہے اوریہی اچھا قانون ہے خدا کی طرف سے ہمیں ملاہے۔اس کے علاوہ اور بھی قوانین ہم کو ملتے ہیں۔مثلاًمصر میں ہیروغلیفی(Hieroglyphic)کے جو کتبے ہمیں ملے ہیں۔ان میں بھی قوانین ہیں۔رومی قانون بھی ملتاہے۔یونانی قانون بھی ملتاہے۔چینی اور ہندوستانی قوانین بھی ملتے ہیں۔امریکہ کے پرانے باشندوں ریڈانڈین(Red Indians)کے ہاں بھی قوانین ملتے ہیں۔غرض دنیاکے ہر ملک میں قانون ملتاہے۔لیکن یہ قانون،علمِ قانون نہیں ہے بلکہ اسے ایک مجموعہ احکام کہاجاسکتاہے۔یعنی یہ کرواوروہ نہ کرو۔علمِ قانون یااصولِ قانون کی کمی ہر جگہ نظر آتی ہے۔یعنی یہ بحث کہ قانون کیاچیز ہے،یہ بحث کہ قانون کس طرح بنتاہے،کس طرح بدلاجاتاہے،کس طرح سمجھاجاتاہے۔اسی طرح قانون کے دواحکام میں اگر تضاد نظر آئے توکس قاعدے پر عمل کیاجائےاور کس قاعدے پر عمل نہ کیاجائے؟غرض یہ کہ قانون اپنے مجرد تصور میں کسی قوم میں موجود نہیں تھا۔جب تک اسلام کادور نہیں آگیااور تاریخ اسلام کی ابتدائی دوصدیوں کے فقہاء نے اس میں اپنااضافہ Contribution پیش نہیں کرلیا۔جیسا کہ آپ سے میں نے عرض کیاکہ مسلمان

اس بات پر فخر کر سکتے ہیں، اس معنی میں کہ قوانین تو دنیا کے ہر ملک میں موجود تھے لیکن علم القانون اپنے مجرد تصور میں کسی قوم نے پیش نہیں کیا تھا۔ یہ اصولِ فقہ وہ علم ہے جسکا اطلاق صرف اسلامی قانون پر ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی قانون پر ہم کر سکتے ہیں۔ اصول فقہ کے جن مسائل کا ابھی میں نے ذکر کیا کہ قانون کیا ہے؟ کس طرح بنتا ہے؟ وغیرہ یہ سوالات میں مسلمان سے بھی کر سکتا ہوں، رومی اور یونانی سے بھی اور ہندو سے بھی کر سکتا ہوں، کہ تمہارے ذہن میں قانون کا کیا مطلب ہے؟ قانون کیسے بنتا ہے؟ اور کون بناتا ہے؟ کب بنتا ہے؟ اور اس میں تبدیلی کس طرح ہو سکتی ہے؟ اسے منسوخ کس طرح کیا جاتا ہے؟ اس میں اضافہ کس طرح کیا جاتا ہے؟ قانون کس اساس پر بنایا جاتا ہے؟ یہ سوالات کسی بھی نظامِ قانون سے کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے جوابات چاہے مختلف ہوں۔ لیکن یہ علم جو ان مجرد تصورات کے متعلق ہے، اس کو پہلی مرتبہ مسلمان پیش کرتے ہیں اور اس کو اصولِ فقہ کا نام دیتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ نام کیوں دیا گیا۔ ایک رائے میں پیش کرتا ہے، میری رائے قرآن مجید کی اس مشہور آیت سے ماخوذ ہے، جس سے آپ سب واقف ہیں: (مثل کلمة طیبه کشجرة طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء)(24:14) (اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی طرح ہوتی ہے جس کی جڑیں تو زمین میں ثبت ہوتی ہیں لیکن اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی جاتی ہیں) یہاں دو خاص لفظ استعمال کیے گئے ہیں جڑ اور شاخیں۔ چنانچہ ہمارے فقہانے اصولِ فقہ کو جڑ قرار دیا اور قانونی قاعدوں یا احکام کو "فرع" قرار دیا۔ یعنی علمِ اصول اور علمِ فروع۔ اصول کے لفظی معنی ہیں جڑیں۔ بہر حال چند اہم ابتدائی تصورات ہوتے ہیں۔ جن کی اساس پر قاعدے بنائے جاتے ہیں۔

یہ چیز غالباً بالکل ابتدائی زمانے میں یعنی عہد نبوی میں یا عہد خلافت راشدہ میں نہ رہی ہوگی۔ لیکن بعد میں اس موضوع پر جو اولین کتابیں لکھی گئیں وہ مسلمان فقہاء کی ہیں۔ گزشتہ صدی تک کسی قوم میں یہ چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا چرچا یورپ میں بھی ہونے لگا۔ مجھے یاد ہے، چالیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب میں 1928ء میں یونیورسٹی لاء کالج میں طالب علم تھا، ان دنوں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام ہے "Angorah Reforms" یہ انگریزی زبان مین ایک فرانسیسی پروفیسر کی تالیف تھی۔ لندن یونیورسٹی کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب میں اسی فرانسیسی پروفیسر کو دعوت دی گئی تھی۔ اس نے وہاں پر تین لیکچر دیئے۔ جن میں پہلے لیکچر کا موضوع۔ "Angorah Reforms" تھا، اتاترک مصطفی کمال پاشا نے ترکی میں پرانی چیزوں کو منسوخ کر کے نئے قوانین نافذ کیے۔ مثلاً سوئٹزر لینڈ کے کوڈ اور اٹلی کے کوڈ وغیرہ وہاں نافذ کیے گئے اور اسلامی قوانین رد کر دیئے گئے اور دیگر چیزیں جو ترکی میں آئی تھیں ترکی ٹوپی کی جگہ ہیٹ (Hat) کا استعمال وغیرہ۔ یہ لیکچر انہی چیزوں کے بارے میں

تھا۔چونکہ "Angorah Reforms" ایک نئی چیز تھی،اس لیے اس زمانے میں اسکا بڑا چرچا تھا۔دوسرے مضمون کا عنوان "Root of Law" یعنی قانون کی جڑیں تھا۔میں اعتراف کرتا ہوں کہ پہلی باراس دوسرے مقالے کو پڑھ کر مجھے اپنی میراث کا علم ہوا کہ مسلمانوں نے کیاخاص کارنامہ(Contribution)انجام دیاہے۔چونکہ کاؤنٹ اوسٹروروگ(Ostrorog)نے،جواس کتاب کامؤلف ہے،بیان کیاکہ یہ کسی اور قوم میں نہیں پایاجاتااور یہ مسلمانوں کی عطاہے اوراس میں ان چیزوں سے بحث ہوتی ہے،یہ اسلامی کارنامہ (Contribution)جودنیاوی علمِ قانون پر روشنی ڈالتاہے وہ اصولِ فقہ کہلاتا ہے۔اصولِ فقہ کا کچھ مفہوم بیان کرنے سے پہلے مختصراًمیں بعض ان چیزوں کودہراؤں گاجو گزشتہ دنوں اشارتاً آپ سے بیان کرچکاہوں۔

اسلامی قانون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سے شروع ہوتاہے،جس کی ابتدامیں کچھ پرانے رسم ورواج ،جومکہ میں تھے وہ بھی شامل رہے اوررفتہ رفتہ اس کی ترمیم واصلاح قرآن وحدیث کے ذریعے سے ہوتی رہی۔اس میں بعض اور چیزوں کو بھی گوارا کیاجاتارہا،جیسے معاہدات،سابقہ امتوں کے شریعتیں جواسلام نے برقرار رکھیں اوراسی طرح کی بعض اور چیزیں۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور قانون کاایک سرچشمہ بند ہوگیایعنی وحی کے ذریعے سے قانون کوبنانے اوربدلنے کی جوصلاحیت ہم میں پائی جاتی تھی وہ ختم ہوگئی توہم مجبورہوگئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت جوچیزیں ہم میں چھوڑی ہیں انہی پراکتفاکریں۔عام حالتوں میں ہمارے لئے یہ بات مشکلات کاباعث بن جاتی،اگراس قانون کی ترقی کی صورت خود قانون سازنے یعنی خدااوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نہ بتائی ہوتی،یہ چیزرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کے آخری دنوں سے تعلق رکھتی ہے۔یمن کوجب ایک گورنر بھیجاگیا،یعنی حضرت معاذبن جبل رضی اللہ تعالی عنہ،توان سے حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے دریافت کیا"فبم تحکم"(کس طرح احکام دیاکروگے؟)جواب دیا۔"بکتاب اللہ"(اللہ کی کتاب کے مطابق)۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا"فان لم تجد"(اگر تم قرآن میں مطلوبہ چیزنہ پاؤتوکیاکروگے؟)توانھوں نے جواب دیا"فبسنة رسول اللہ"(رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی سنت کے مطابق احکام دیاکروں گا)رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پرمزید سوال کیا "فان لم تجد" (اگرسنت میں بھی مطلوبہ چیزنہ ملےتوکیاکروگے؟) توان کے الفاظ تھے "اجتهدبرايي ولاآلو" (میں اپنی رائے کے مطابق اجتہادکروں گااور کوئی دقیقہ نہیں چھوڑوں گا)اس کورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف پسند فرمایابلکہ دعادی اورآسمان کی طرف ہاتھ۔اٹھاکریہ کہاکہ"اے اللہ!تونے اپنے رسول اللہ(صلی اللہ علیہ وسلم)کے رسول کوجس چیزکی توفیق دی ہے اس سے تیرارسول خوش ہے۔" اس سے بڑھ کراور کوئی تعریف نہیں ہوسکتی۔یہ چیزاسلامی قانون کوزندگی دینے والی،برقراررکھنے والی

اور ہر ضرورت میں کام آنے والی ہے۔اس کی وجہ سے ایک غیر جانبدار شخص بھی یہ کہہ سکتاہے کہ اسلامی قانون چودہ سو سال سے لے کر آج تک چلا آرہاہے اوراس میں آئندہ بھی چلنے کی قوت باقی ہے۔اگر یہ چیز نہ ہوتی،تو صرف قرآن اور حدیث پر اکتفا کرنے کی صورت میں، ممکن ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کی آیتوں اور حدیثوں سے استنباط نہ کرسکتے اوروہ حیران رہ جاتے کہ ہم کیا کریں واقعۃً یہ صورت بعض وقت پیش آتی ہے کہ ایک چیز سے بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں استنباط کرلیتے ہیں اور بعض دوسرے لوگوں کی نظر اس تک نہیں پہنچتی اوروہ ششدرو حیران رہ جاتے ہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال آپ کو دوں گا جس کا تعلق امام اعظم (رحمۃ اللہ) سے ہے۔اس سے ان کی ذہانت کا ذکر کرنا مطلوب نہیں ہے بلکہ صرف مثال دیناہے کہ کس طرح ایک ہی چیز سے بعض لوگ سمجھ جاتے ہیں اور بعض لوگ سمجھ نہیں سکتے۔لطیفے کے طور پر قصہ بیان کیا گیاہے ایک دن ایک خاندان میں میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔رات کے وقت پہلے شوہر نے یہ قسم کھائی اوراپنی بیوی سے کہاکہ طلوع آفتاب سے قبل اگر تو مجھ سے بات نہ کرے گی تو تجھے طلاق ہے۔بیوی بھی بہت جلی بھنی تھی،اس نے بھی قسم کھا کر کہاکہ خدا کی قسم طلوع آفتاب سے قبل میں تم سے بات نہیں کروں گی۔پھر دونوں چپ ہوگئے۔سوئے یانہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن دونوں چپ ہوگئے۔اس کے بعد اذان ہوئی اور طلوع آفتاب کاوقت آگیا۔شوہر پہلے نماز کو جاتاہے اور پھر ابن سیرین نامی مشہور فقیہ کے پاس جاکر ساراقصہ سناتاہے۔وہ کہتے ہیں کہ میاں قصور تمہاراہے،طلاق ہوگئی،کیوں کہ تم نے کہا تھا کہ بیوی اگر طلوع آفتاب تک بات نہ کرے تو طلاق ہو جائے گی۔اس نے بات نہیں کی۔میں کچھ نہیں کر سکتا۔وہ روتا دھوتا امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس پہنچا۔وہی قصہ ان کو بھی سنایا۔توامام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہاکہ کوئی بات نہیں۔تم شوق سے اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔طلاق وغیرہ کوئی نہیں ہوئی۔وہ شخص حیرت زدہ رہ گیااسی عالم میں واپس ابنِ سیرین کے پاس پہنچتاہے اور کہتاہے کہ تمہارے بعد میں امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس گیا تھاوہ کہتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی۔انھیں تعجب ہواکہ یہ کیسے ہو سکتاہے۔چنانچہ اسی شخص کے ساتھ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس آئے۔کہنے لگے: "ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ)اللہ سے ڈرو تم کیاغضب کررہے ہو۔اس کی عورت کوطلاق ہوچکی ہے۔تم کہتے ہو کہ طلاق نہیں ہوئی۔وہ اس کے ساتھ۔رہے گاتوزناکاری ہوگی۔تم اس کے ذمہ دار ہوگے۔خدا کے ہاں کیاجواب دوگے؟" امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا: "میاں قصہ ذرادوبارہ سناؤ۔" اس نے سنایا۔پہلے میں نے بیوی سے کہاتھاکہ اگر طلوع فجر تک اگر بات نہ کرے تو طلاق ہے۔بیوی نے اسی وقت جواب دیاکہ خدا کی قسم میں تجھ سے طلوع آفتاب تک بات نہیں کروں گی۔توامام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہامیں اپنی رائے پر قائم ہوں۔طلاق نہیں ہوئی کیونکہ اس شخص

نے یہ نہیں کہا کہ عورت کونسی بات کرے۔ جب اس نے کہا کہ میں تم سے بات نہیں کروں گی تو بات کرنا ہی ہوا۔ ان حالات میں یہ شرط کہ عورت بات نہ کرے تو طلاق ہو گی، پیش ہی نہیں آئی۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح ایک ہی واقعہ سے ایک شخص کچھ سمجھ لیتا ہے اور دوسرے شخص کی نظر اس نکتے تک نہیں پہنچتی۔

غرض اسلامی قانون کی ترقی کے متعلق اگر اجتہاد کی اجازت نہ دی جاتی تو سب لوگوں کو صرف قرآن وحدیث پر اکتفاء کرنی پڑتی اور ممکن تھا کہ کسی وقت بڑے سے بڑے عالم اور فقیہ کو کسی نئے مسئلے کے متعلق نہ قرآن مین کوئی حکم ملے اور نہ حدیث میں۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ ایک بار حضرت عمر (رضی اللہ تعالی عنہ) کے ایک فیصلے پر حضرت علیؓ نے کچھ توجہ دلائی تو حضرت عمرؓ نے بے ساختہ کہا "**لولا علی لهلك عمر**"۔ اس اجازت کے تحت جو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دی گئی تھی کہ "اجتہاد کرو" اجتہاد کا اصول ہاتھ آگیا۔ اور دشواریاں ختم ہو گئیں۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں کبھی کبھی اجتماعی غوروفکر بھی ہوتا تھا۔ لوگ آپس میں بحث کرتے کہ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے؟ ایک صاحب اگر ایک چیز بیان کرتے تو دوسرے صاحب اس پر اعتراض کرتے، نہیں صاحب! یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں فلاں خامی ہے، یوں کرنا چاہیے۔ اوراس آپس کے بحث مباحثے سے لوگ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے۔ اس زمانے میں خاص کر یہ چیز مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام واقوال ابھی تک جمع نہیں ہوئے تھے۔ بخاری، مسلم اور صحاح ستہ کی کتابیں ابھی لکھی نہیں گئی تھیں بلکہ لوگوں کے علم اور حافظے میں تھیں۔ جب آپس میں مل کر مشورہ کرتے تو اس وقت بعض بھولی بسری باتیں یاد آجاتیں، کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن یونہی فرمایا تھا۔ اس طرح اسلامی قانون کے متعلق جو معلومات حدیث میں تھیں ان کو جمع کر کے قانونی احکام استنباط کرنے کا آغاز ہو گیا۔

ان علمی مراکز میں جہاں نسلہا نسل تک فقہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، قانون کی تدوین کے کام میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز مدرسہ کوفہ کا تھا، جہاں اسلامی قانون کی تعلیم دی جاتی رہی۔ شہر کوفہ آج بھی عراق میں موجود ہے اور اگرچہ ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن اس کی تاریخی اہمیت بڑی رہی ہے اس علاقے کو کچھ خصوصیتیں حاصل ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان خصوصیتوں کے باعث یہ امتیاز اسے حاصل ہے یا محض اتفاقی بات ہے ۔ وہ خصوصیتیں یہ ہیں کہ جس مقام پر آج شہر کوفہ آباد ہے۔ پرانے زمانے میں اس کے نواح میں "حیرہ" نامی شہر آباد تھا، جس کے کھنڈرات اب بھی ملتے ہیں۔ حیرہ وہ شہر ہے جو زمانہ

جاہلیت میں تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہ شہر اگرچہ ایرانیوں کے قبضے میں تھا، وہاں یمنی عرب آکر آباد ہو گئے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب میں یمن کا علاقہ سب سے زیادہ سرسبز و شاداب تھا اور قدیم زمانے میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا تھا۔ جب وہاں کے لوگ حیرہ میں آباد ہوئے تو ان کی تہذیب نے آس پاس کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ ایران کے شہنشاہ نے اپنے ولی عہد کو بچپن میں تعلیم و تربیت کے لیے حیرہ بھیجا۔ اسے پورا اعتماد تھا کہ عرب حکمران کی نگرانی میں تربیت پا کر اسکے بیٹے کا کردار سنور جائے گا۔ اس کا خیال صحیح ثابت ہوا اور بچہ جو بہرام گور کے نام سے مشہور بادشاہ گزرا ہے اس کا شکر گزار رہا، چنانچہ اس بادشاہ کی جو تصویریں ملتی ہیں ان میں اسے بدوی لباس میں ایک اونٹ پر سوار دکھایا گیا ہے۔ بہر حال حیرہ وہ مقام تھا جہاں پرانے زمانے میں ایک بہت ہی ممتاز عربی سلطنت گزر چکی ہے اور عربی یعنی یمنی اور ایرانی روایات کا سنگم ہو کر نئی شکل کا تمدن اس مقام پر نظر آتا ہے۔ یہ اور علاقوں سے ممتاز اور برتر تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانے میں عراق فتح ہوا تو انھوں نے اپنی سیاسی فراست کی بنا پر فوراً فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ عربوں کو عرب سے بھیجا کہ جا کر اس مفتوحہ علاقے کے اندر کسی ایسے مقام پر آباد ہو جاؤ جو فوجی نقطہ نظر سے اہم ہو تاکہ بوقت ضرورت تمہیں کمک پہنچائی جا سکے اور تم بوقت ضرورت فوراً فساد اور فتنے کے مقام پر جا کر دشمن کی سرکوبی کر سکو۔ انھوں نے، علاوہ اور شہروں کے، حیرہ کو اسلامی چھاؤنی بنانے کے لیے بھی انتخاب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اپنی فراست سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ پرانے شہر کے اندر مسلمانوں کو بسانا مناسب نہیں۔ اس مقام کو تو انھوں نے چن لیا لیکن شہر کو نہ چنا۔ چنانچہ حکم دیا کہ اس شہر کے مضافات میں ایک نیا شہر بسالو۔ تمہارے علاقے میں اجنبی نہ رہیں اور ان کے علاقے میں تم نہ رہو۔ یہ خالص اسلامی شہر ہو۔ اس میں بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے جو نو آبادکار بھیجے وہ بیشتر یمن کے تھے۔ یمن ہی سے دوبارہ مہاجرین کا ایک سیلاب آتا ہے اور اسی پرانے مقام پر بستا ہے۔ لیکن صرف یمنی ہی نہیں، ان میں غالباً اٹھاون ایسے صحابہ بھی تھے جو جنگ بدر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ الغرض اسلامی روایات کے حامل لوگوں کی ایک جماعت تھی جو شہر کوفہ میں آباد ہوئی اور اسطرح پرانی روایات میں ایک نئی تہذیب کا اضافہ ہوتا ہے۔ جب اس مقام پر کئی ہزار کی اسلامی آبادی ہو گئی تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کی ضرورت ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے وہاں کی جامع مسجد میں، جو اس وقت گورنر کے مکان کا جزو تھی، ایک بڑے عالم صحابی کو بھیجا۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ تھے۔ جن کے تقررنامے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالی نے یہ لکھا کہ "اے اہل کوفہ! میں اپنے آپ پر تم کو ترجیح دیتا ہوں اور ایثار کر کے میں اس شخص کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں جس کی مجھے ضرورت ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت ہی محترم صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں جو بطور معلم کے تمہارے پاس آتے ہیں۔ ان سے استفادہ کرنے میں غفلت نہ کرنا۔ حضرت عبداللہ بن

مسعود رضی اللہ تعالی عنہ کے متعلق جیسا میں نے بیان کیا، وہ فطرتاً قانون کی طرف مائل تھے۔ وہ وہاں مقیم رہے اور اپنے شاگردوں کو زیادہ تر فقہ کی تعلیم دیتے رہے۔ ان میں قانونی نکتہ آفرینی اور استدلال کا خاص ملکہ تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد علقمۃ النخعی، پھر انکے شاگرد ابراہیم نخعی، پھر انکے بعد ان کے شاگرد حماد بن ابی سلیمان جو ایرانی تھے، پھر ان کے بعد امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) جو ایرانی تھے، وہ اس سلسلے میں چوتھی نسل میں وہاں کارفرما ہوئے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت 80ھ میں ہوئی اور وفات 150ھ میں۔ عباسی خلافت 132ھ میں شروع ہوئی۔ گویا بنی امیہ کا آخری دور اور بنی عباس کا ابتدائی دوران کے سامنے گزرا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا دوبارہ ذکر اس لیے آیا ہے کہ ان کی تالیفات میں ایک تالیف "کتاب الرائی" کے نام سے ہے۔ جیسا کہ آپکو معلوم ہے کہ اگر قرآن وحدیث میں صراحتاً حکم موجود نظر نہ آئے تو اجتہاد کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اجتہاد رائے کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ کے الفاظ یہ تھے "اجتھد برائی" (اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا) تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھ ڈالی۔ "کتاب الرائی" یعنی آدمی رائے کس طرح سے قائم کرے۔ مسائل میں رائے کا استعمال کس طرح ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ غالباً جب بغداد پر ہلاکو خاں کا حملہ ہوا اور وہاں کی لاکھوں کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک کر تباہ کر دی گئیں تو ممکن ہے اس کتاب کے نسخے بھی اس ضائع شدہ ذخیرے میں رہے ہوں اور ضائع ہو گئے ہوں۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ اس کے مندرجات کیا تھے، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ قدیم ترین کتاب ہے جسکی طرف ہمارے مؤلف اشارہ کرتے ہیں اور جو اصول فقہ کے موضوع کی گویا اولین کتاب ہے۔

اصول فقہ غالباً اپنے موجودہ مفہوم میں پورے کا پورا اس میں نہیں ہو گا۔ لیکن رائے سے استفادہ کر کے قانون کو بدلنا، قانون کا مفہوم معلوم کرنا، اس کی تاویل کرنا غالباً اس میں بیان کیے گئے ہوں گے۔ یہ اولین کتاب ہے جس کا ذکر ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس موضوع پر پہلے بھی تحریراً اور عملاً کام کیا گیا ہو یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استادوں نے بھی رائے سے کام لے کر فتوے دیے ہوں اور سوالوں کا جواب دیا ہو۔ لیکن یہ انھوں نے اس اس پر کوئی کتاب لکھی تھی، اب تک ہمیں اس کا پتہ نہیں چلا۔ اس لیے فی الحال ہم فرض کریں گے اس موضوع پر پہلی کتاب امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی "کتاب الرائی" ہے۔ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے قانون کی بہت بڑی خدمت کی۔ اس خدمت میں ایک تو "کتاب الرائی" کا لکھنا ہے، اس کے علاوہ ایک اور چیز کی طرف اشارہ کروں گا۔ وہ یہ کہ انھوں نے انٹرنیشنل لاء پر بھی ایک کتاب لکھی، جس کا انشاء اللہ کل کے لیکچر میں صراحت سے بیان ہو گا۔ انٹرنیشنل لاء بھی ایک ایسا علم ہے جو اسلام سے پہلے عملاً دنیا میں موجود نہیں تھا۔ اس چیز کو علمی حیثیت سے، ساری دنیا کے لوگوں کے استعمال میں آنے

والا، انٹر نیشنل لا بنانا مسلمانوں کا کام ہے۔ اس موضوع پر امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک کتاب لکھی، جسے "کتاب السیر" کا نام دیا جاتا ہے۔ اور ایک چیز جس کا مجھے ذکر کرنا ہے وہ یہ کہ انھوں نے علم کا ذوق بھی اپنے شاگردوں میں پیدا کیا۔ اس ذوق کا مطلب یہ نہیں کہ مولوی نے جو بتایا اسے طوطا مینا کی حفظ کریں اور حسب ضرورت دہرا لیا کریں۔ یہ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کا تصورِ تعلیم نہیں تھا۔ وہ اپنے شاگردوں میں اجتہاد، فکر اور آزادی رائے کی صلاحیت راسخ کر دیتے تھے۔ چنانچہ ہر مسئلے پر انکے شاگرد آزادنہ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور بحث و تمحیص کے بعد معقول دلائل کی بنیاد پر ردو قبول ہو تا۔ استاد یا شاگرد ہٹ دھری نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ فقہ حنفی میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر شاید پندرہ فیصد احکام میں عمل کیا جاتا ہو اور باقی پچاسی فیصد مسئلوں پر صاحبین کی رائے، یعنی اگر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ متفق ہوں تو ان کی رائے پر فتوی دیا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر نہیں دیا جاتا۔ یہ سب اس تربیت کا نتیجہ ہے جو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کو دیتے رہے کہ اندھی تقلید نہ کرنا۔ خود سوچنا، آزادی رائے رکھنا اور حق کے سوا کسی اور چیز کو قبول نہ کرنا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام "کتاب الاصول" تھا۔ تصور کیا جاتا ہے یہ اصول فقہ کے متعلق تھی یا غالباً "کتاب الرائی" کی شرح ہو گی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "کتاب الرائی" لکھنے کے بعد اس کا درس بھی دیا ہو گا۔ درس کے دوران میں شرح ہوئی ہو گی اور اعتراضات بھی ہوں گے۔ اس مباحثے کے نتیجے کے طور پر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الاصول" لکھ ڈالی۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب بھی ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ دوسرے شاگردوں میں ممتاز شاگرد امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ایک حالیہ شائع شدہ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اب مطبوعہ کتاب میں امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الاصول" کے کچھ حوالے بھی آگئے ہیں۔ یہ مطبوعہ کتاب ایک معتزلی مذہب کے امام ابو الحسین البصری کی تالیف (المعتمد فی اصول الفقہ) ہے۔ معتزلی فرقے کی کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔ اتفاق سے المعتمد کے چار پانچ مخطوطے ملتے ہیں۔ دو استنبول میں ہیں۔ یمن کے ایک نسخے کے فوٹو مصر میں ہیں۔ دوسرا مخطوطہ میرے پاس ہے جو شہر بیت الفقیہ (یمن) کے قاضی صاحب نے ازراہ نوازش مجھے بطور تحفہ دیا تھا۔ ایک نامکمل نسخہ میلانو (اٹلی) میں بھی ہے۔ ان سب نسخوں کی مدد سے اس کتاب کو شائع کیا گیا ہے۔ جو معتزلی اصول فقہ کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ لیکن مجھے اس کتاب سے زیادہ اس کے ایک جملے پر آپ کی توجہ منعطف کرانی ہے۔ امام محمد الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ "اصول فقہ چار چیزیں ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس" یہ گویا ان کی کتاب کا خلاصہ تھا۔ جس کی طرف ابو الحسین البصری کی کتاب میں اشارہ ملتا ہے۔ اس بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ہی نہیں، متعدد شاگردوں نے "کتاب الرائی" کی شرح کے طور پر اصولِ فقہ کی کتابیں لکھ۔

ڈالیں۔اس رائے کے قائم کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے بیان کیا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف "کتاب السیر" منسوب ہے،یعنی انٹر نیشنل لاء پر انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔اگرچہ سوائے چند اقتباسات کے وہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی لیکن اسی نام کی کتابیں ان کے کم سے کم تین یا چار شاگردوں نے لکھی ہیں۔ابراہیم الفزاری ایک شاگرد تھے ان کی "کتاب السیر" مخطوطے کی صورت میں موجود ہے۔محمد شیبانی نے "کتاب السیر الصغیر" اور کتاب السیر الکبیر" کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔یہ دونوں ہم تک پہنچ چکی ہیں۔اس طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور شاگرد زفر نے بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب السیر" تھا۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے معاصرین میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب السیر" کے نام سے ایک ایک کتاب لکھی۔ایک اور معاصر،واقدی نے جو مشہور مؤرخ تھے،انٹر نیشنل لاء کے موضوع پر اسی نام کی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔جس طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب السیر" سے متاثر ہو کر اور انٹر نیشنل لاء پر ان کے لیکچروں کی اساس پر،ان کے کئی شاگردوں نے "کتاب السیر" کے نام سے کتابیں تصنیف کیں۔اسی طرح شاید "کتاب الرائی" کی تدریس کے سلسلے میں بھی وہی صورت پیش آئی اور ان کے بعض شاگردوں نے اس موضوع پر بھی کتابیں لکھیں،ممکن ہے کہ اس کو اصول کا نام بھی خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہو،"کتاب الرائی" کی تدریس کے سلسلے میں اس امر کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ کتاب الاصول یعنی علم الاصول کی جو کتابیں مسلمانوں میں پائی جاتی تھیں ان میں سے ابتدائی تین کتابیں یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الرائی" اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ،امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ کی "کتاب الاصول" ہم تک نہیں پہنچیں۔جو کتاب ہم تک پہنچی وہ امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد امام شافعی رحمۃ اللہ کی ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بیک وقت کئی سلسلوں اور روایتوں (Traditions) سے منسلک تھے۔وہ ایک سو پچاس ہجری میں پیدا ہوئے۔اسی سال امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔براہ راست وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ نہیں کر سکے،لیکن سالہاسال تک ان کے ممتاز شاگرد امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رہے۔اسی طرح مدینہ منورہ جاکر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سالہاسال تک درس لیتے رہے۔انھوں نے فلسفہ و منطق کی بھی تعلیم پائی اور علم الکلام کی بھی۔اس زمانے میں معتزلہ فرقے کا بہت بول بالا تھا۔ان سے مباحثے بھی کرتے رہے۔اس لیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات کئی ایسی چیزیں جمع ہو گئیں جن کے باعث وہ اسلام کی بہت اہم خدمات انجام دے سکے،جن میں سے ایک حسب ذیل ہے۔مسلمانوں میں جیسا کہ آج ہے،پرانے زمانے میں بھی کچھ۔لوگ قدامت پسند تھے اور کچھ جدت پسند۔ان دو متضاد رحجانات کے لوگ ہر معاشرے اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔بہر حال اس زمانے میں اگر بعض لوگ حدیث کی تعلیم پانے اور جمع کرنے کے کام میں مشغول تھے تو کچھ لوگ دوسرے علوم سے دلچسپی رکھتے

تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض فقہاء جنھیں قانون کے علم سے دلچسپی تھی، منطق اور فلسفے کی مدد سے اسلامی قانون کو ترقی دینے میں مشغول تھے۔ان کی توجہ حدیث کی طرف سے ہٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں اہل حدیث اوراہل رائے میں ایک شدید کشمکش پیداہوگئی۔اہل حدیث سے مراد وہ لوگ ہیں جورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام واقوال کو جمع کرنے اور مطالعہ کرنے میں مشغول تھے اوراہل رائے سے مرادوہ فقہاء تھے جو اسلامی قانون کو جمع کرنے اور قیاس اوراستنباط کی مدد سے اس کوترقی دینے میں مشغول تھے۔دونوں میں کشمکش اس بناء پر بھی کہ اہل الرائے کوحدیث سے کم واقفیت تھی اوروہ اس بات کو فرض کرلیتے تھے کہ حدیث میں یہ چیز نہیں پائی جاتی۔اس سکوت کے باعث وہ قیاس کرکے نئے احکام دیا کرتے۔بعض اوقات ایساہوتا کہ اس مسئلے متعلق حدیث میں ذکرموجودہوتالہذااہل حدیث کہتے یہ لوگ توکافرہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہوتے ہوئے اسے نظر انداز کرتے ہیں۔حالانکہ وہ عمداًایسانہیں کرتے تھے۔انھیں واقفیت نہ ہوتی تھی۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اہل حدیث (محدثوں)سے بھی تعلیم پائی اوراہل الرائے فقہاسے بھی۔انھیں فلسفہ وکلام پر بھی دسترس حاصل تھی۔ان کی ذات میں ایسااچھااسلام عالم پیداہوگیاجوگویاایک نقطہ اتصال پیداکرنے اورربط پیداکرنے کاباعث بن سکا۔چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کاسب سے بڑاکارنامہ یہ رہاہے کہ اہل حدیث اوراہل الرائے کومتحد کردیں۔حدیثوں سے وہ زیادہ واقف تھے اوراستباط واستقراء اوراجتہادکے فن میں بھی ماہر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایسی چیز بیان کرتے جس سے اہل حدیث بھی خوش رہتے اوراہل الرائے بھی خوش ہوتے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کاایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں اتحادپیداکرنے کے لئے انھوں نے "کتاب الرسالہ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصول فقہ کی قدیم ترین کتاب جودنیامیں پائی جاتی ہے۔وہ"کتاب الرسالہ" ہے۔اب اس کے ترجمے مغربی زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ممکن ہے اردومیں بھی اس کاترجمہ ہوچکاہو یہ کہاجاسکتاہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے الرسالہ، لکھ۔کرایک نئے علم کی بنیادڈال دی،کم ازکم بنیاد مستحکم کردی،اس میں جوچیزیں بیان کی گئی ہیں۔بعد کی صدیوں میں بھی ذرابھی بدلتی ہوئی نظر نہیں آئیں حتی کہ اصطلاحات بھی جوامام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استعمال کی ہیں۔ من وعن آج چودہ سوسال تک چلی آرہی ہیں۔رسالہ کے معنی ہوتے ہیں خط۔اس کاپس منظر یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک شاگرد کی درخواست پر،جس نے کہاتھا کہ استاد ہمیں اس موضوع پریعنی اصول فقہ پرایک تحریر لکھ دیجئے جس سے ہم استفادہ کریں،ڈیڑھ سوصفحوں کاایک خط بھیجا۔اس میں تفصیل سے بتایاگیاہے کہ قانون کسے کہتے ہیں؟قانون کس طرح بناتے ہیں؟پراناقانون کس طرح منسوخ کرتے ہیں؟الفاظ کو سمجھنے کے لیے کیاطریقہ اختیارکرناچاہیے؟اس میں لغت، قواعدزبان،بلاغت وعروض کے علوم پرروشنی ڈالی گئی ہے اورمثالیں بھی دی گئی ہیں اورساتھ ساتھ بہت ہی دقیق اندازمیں اپنے مخالفین کے جوابات بھی

دیے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں معتزلہ فرقہ عروج پر تھا۔ اس فرقے کا نظریہ یہ تھا کہ حدیث پر اعتماد کرنا آسانی سے ممکن نہیں۔ چنانچہ اب یہ مشہور ہو گیا ہے کہ معتزلہ حدیث کو رد کرتے تھے۔ لیکن یہ افتراء ہے، حقیقت میں ایسا نہیں میں نے ابو الحسین البصری کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ معتزلہ فرقے کے مؤلف کی تالیف ہے۔ اس میں وہ تفصیل سے بتاتا ہے کہ حدیث پر کس طرح اعتماد کیا جائے، حدیث کے متعلق اس کی جو رائے رہی ہے کوئی سنّی بھی اسکے بیان کردہ اصول سے بہ مشکل اختلاف کر سکے گا۔ تو وہ کیا چیز تھی جسکی بنا پر معتزلہ کو مطعون کیا جاتا تھا کہ وہ حدیث کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا کیا، اس کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

معتزلہ فرقے کے علماء کی رائے یہ تھی کہ "اگر حدیث میں کوئی حکم دیا گیا ہو یا اس سے کوئی قانون بنتا ہو تو ضروری ہے کہ اس حدیث کے راوی ایک سے زیادہ ہوں۔ خبر واحد یعنی ایک راوی کی بیان کردہ حدیث پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے نہیں کہ وہ غلط ہے بلکہ اس لیے کہ قانون کا تقاضا ہے کسی دعوی کی تائید دو گواہ کریں۔ اس رائے کی دوسرے مسلمان فقہاء نے تردید کی۔ اہل حدیث کے محدثین نے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب عالمانہ انداز میں دیا۔ اسکے بعد سے معتزلہ کا جو اعتراض تھا کہ خبر واحد نا قابل اعتماد ہے، اس کی اہمیت بالکل ختم ہو گئی اور صرف ایک راوی کی بیان کردہ حدیث پر بھی سب لوگ عمل کرنے لگے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے ایسے بہت سے واقعات انتخاب کرکے بیان کیے جن میں کسی ایک آدمی کی شہادت پر کسی حکم کی تعمیل کی گئی ہو مثلاً انھوں نے کہا کہ ایک دن فجر کی نماز کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بھیجا کہ مختلف محلّوں میں جاکر لوگوں سے با آواز بلند کہہ دو کہ قبلہ اب بیت المقدس کی جگہ کعبہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ایک ہی شخص بھیجا گیا۔ اس نے کہا کہ نماز میں اپنے رخ کو بجائے بیت المقدس کے کعبے کی طرف موڑ لو۔ تب لوگوں نے اس پر عمل کیا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ عہد نبوی میں ایک شہادت پر عمل کیا جاتا تھا اور یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ "اگر دو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطلاع دیں تو ہم مانیں گے ورنہ ہم رد کر دیں گے۔" اسی طرح انھوں نے ایک اور مثال دی کہ ایک دن مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر کردہ ایک شخص ڈھنڈورا پیٹتا ہوا نکلتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے کہ اے مسلمانو! شراب کی ممانعت کا حکم نازل ہوا ہے، شراب نہ پیئو۔ یہ صرف ایک آدمی تھا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں (اور یہ صحیح بخاری کی حدیث ہے) کہ یہ انکے بچپن کا واقعہ ہے۔ جب وہ شخص ڈھنڈورا پیٹتا ہوا ان کے مکان کے پاس سے گزرا، اس وقت وہ اپنے والدین کے مہانوں کو شراب کے پیالے پیش کر رہے تھے۔ شراب کی ممانعت کا حکم سنتے ہی ان کے باپ نے کہا، بیٹا اٹھو اور اس شراب کو ضائع کر دو۔ چنانچہ میں نے ایک

ہتھوڑا لیا اور شراب کے پیپے کو توڑ کر اسے بہا دیا۔ جو لوگ شراب پی رہے تھے انھوں نے بھی پیالے پھینک دیے۔ وہاں بھی صرف ایک شخص کی اطلاع پر سب لوگوں نے عمل کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی مثالیں دی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل کرنے کے لیے ایک شخص کی گواہی کافی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کارنامہ تھا کہ اہل حدیث اور اہل الرائے کو متحد کر دیا تاکہ اس طرح اسلامی قانون کی زیادہ بہتر خدمت ہو سکے۔ اب تک اہل حدیث صرف حدیث کو پڑھتے، یاد رکھتے اور بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے اور دیگر علوم سے انھیں واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ منطق، فلسفہ، استدلال وغیرہ سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعض وقت وہ لفظی مفہوم لے کر اس کے اطلاق پر اصرار کرتے جو نامناسب بات تھی۔ دوسری طرف اہل الرائے ہر چیز میں قیاس کرتے اور اچھی طرح تحقیق نہ کرتے کہ حدیثوں میں کسی مسئلے کے متعلق کیا احکام موجود ہیں؟ اس سے بے خبر رہ کر وہ اپنی رائے سے قانون سازی کرتے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فیضان ہے کہ محدثین اپنے مواد میں ایک نظم پیدا کرتے ہیں اور بالا بواب حدیثیں لکھتے ہیں ایک ہی موضوع پر متعدد حدیثیں ہوتی ہیں تو انھیں ایک ہی جگہ جمع کرتے ہیں تاکہ ہم غور کر سکیں کہ کون سی حدیث مقدم ہے کون سی حدیث مؤخر ہے، کون سی ناسخ ہے، کون سی منسوخ ہے۔ ایک طرف یہ اور دوسری طرف اہل الرائے بھی حدیث کا مطالعہ کرنے لگے۔ اسطرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش سے اسلامی قانون کی ترقی کے لیے ایک نئی راہ کھل گئی۔

اس وقت تک چار کتابوں کا بیان ہوا۔ "کتاب الرائی" امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی، "کتاب الاصول" ان کے دو شاگردوں کی اور "کتاب الرسالہ" امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک تقریباً چودہ سو سال کا زمانہ ہوتا ہے انہی ابتدائی کتابوں کی شرح کے سوا اور کوئی چیز نہیں ملتی۔ اس علم سے شغف زیادہ تر ترکستان والوں کو رہا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس علم کو ترقی ترکوں نے دی اور ایسی بیسیوں کتابیں لکھی گئیں جو یا تو تکرار پر مبنی ہیں، یا شرح پر یا خلاصوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ایک بڑی ضخیم کتاب ابو الحسین البصری نے لکھ ڈالی جو دو جلدوں میں ہزار ڈیڑھ ہزار صفحوں پر چھپی ہے۔ اس کا پڑھنا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ اسکا خلاصہ امام بیضاوی نے بیس صفحوں میں کر ڈالا جو چیستان بن کر رہ گیا۔ پھر بیضاوی کے اس مختصر رسالے کی شرح اور حاشیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کتاب تو درس کے طور پر بیضاوی کی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن اس کو سمجھانے کے لیے شرحوں اور حاشیوں اور حاشیتہ الحواشی کی ضرورت پیش آتی۔ غرض یہ سلسلہ اب تک چلا آ رہا ہے۔

زمانہ حال میں اس میں اگر کسی نے نئی چیز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ ہمارے مرحوم سر عبدالرحیم تھے، جو ایک زمانے میں ہندوستان کی اسمبلی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ بعد میں وہ پاکستان میں بھی رہے انھوں نے قانون حیثیت سے پاکستان کی بڑی خدمت کی ہے۔ ایک زمانے میں جب وہ مدراس ہائی کورٹ کے جج تھے تو کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر غالباً ٹیگور لا لیکچرز کے سلسلے میں، انھوں نے اصول فقہ پر کچھ لیکچر دیے تھے جو محمڈن جیورسپروڈنس (Muhanandan Jurisprudence) کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں۔ ان میں انھوں نے ایک تھوڑی سی جدت کی ہے اور یہ کہ پرانی اصولِ فقہ کی کتابوں کے بیانات کو اور مواد کو بھی بیان کر دیا ہے اور حالیہ زمانے میں یورپ میں فلسفہ قانون وغیرہ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سے بھی استفادہ کرکے اسلامی اور یورپی اصول قانون کے موازنے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے عبدالرحیم کی محمڈن جیورسپروڈنس اصول فقہ کی ایک ایسی کتاب ہے جو ہمارے پرانے اصول فقہ کی کتابوں میں ایک نیا باب کھولتی ہے۔ اس میں ہمیں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جنکا ذکر پرانی اصول فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر پرانی اصول فقہ کی کتابوں میں پہلا سوال یہ ہو گا کہ قانون کے ماخذ کیا ہیں؟ وہ کہیں گے قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس۔ ان میں یہ ذکر نہیں ہو گا کہ قوانین کس کس موضوع کے ہوتے ہیں۔ کچھ۔ عبادات ہیں، کچھ معاملات ہیں، کچھ قانون تعزیرات و قانون وراثت ہے۔ لیکن اور بھی چیزیں ہیں، جیسے انٹرنیشنل لاء اور کانسٹی ٹیوشنل لاء وغیرہ۔ ہماری پرانی فقہ کی کتابوں میں انکا کوئی ذکر نہیں آیا جسٹس سر عبدالرحیم نے اصولِ قانون کے یورپی مؤلفین کی طرح ان قوانین کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ان کا علمی کارنامہ ہے کہ قدیم وجدید معلومات کو اپنی جامع کتاب میں سمو دیا ہے۔ اب آخر میں مجھے اجتہاد کے بارے میں اشارۃً کچھ کہنا ہے جس کا اعلان میرے لیکچر کے موضوع کے طور پر کیا گیا ہے۔ اجتہاد کیا چیز ہے؟ میرے گذشتہ دنوں کے بیانات سے آپ اندازہ کر چکے ہوں گے اجتہاد کرنے کی اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس شرط پر دی تھی کہ قرآن وحدیث میں انکو سکوت نظر آئے۔ اگر قرآن میں صراحت آتی ہے تو بھی اجتہاد کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب یہ دونوں بنیادی اساس یعنی قرآن وحدیث ہمارے سوال کے متعلق خاموش نظر آئیں۔ قانون سازی کی اس کوشش یعنی اجتہاد کو ہمارے فقہاء نے بہت ترقی دی اور اس کے لیے لطیف فرق کی بنا پر بہت سے نام دیے ہیں۔ چنانچہ اجتہاد کا لفظ بھی ہے قیاس کا لفظ بھی ہے۔ استدلال کا لفظ بھی ہے اور اسی طرح استصلاح کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سب بالکل مترادف چیزیں نہیں بلکہ ان میں باہم لطیف سا فرق پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں "استحسان" کا میں خاص طور پر ذکر کروں گا۔ استحسان حنفی مذہب کی ایک خصوصیت ہے جس کو دوسرے فقہی مکاتب فکر کے لوگ پسند نہیں کرتے۔ یہ ناپسندیدگی ایک غلط فہمی کی بنیاد پر ہے، لیکن بہر حال اسے پسند نہیں کرتے چنانچہ آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "الرد علی

الاستحسان" جو استحسان کی تردید کے دلائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں نظر آتا ہے کہ انہوں نے استحسان کا ایک فرضی مفہوم لے کر اسکی تردید کی ہے۔ حنفی مکتب فکر کے مطابق استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے کے ظاہری حالات کی بنا پر کوئی بات ذہن میں آتی ہے تو اس پر اکتفانہ کی جائے بلکہ گہرے غور و فکر کے بعد عمیق تر حقائق کے پیش نظر حکم دیا جائے۔ چنانچہ استحسان سے کام لینے والے حنفی ائمہ محض ظاہری حالات کو کافی نہیں سمجھتے اور ایک عمیق تر سبب معلوم کر کے اس کی بنیاد پر احکام دیتے ہیں۔ ایک مثال میں آپ کو دوں گا۔ فرض کیجئے کہ میں آپ میں سے کسی کے سپرد کچھ امانت کروں، کہ اسے فلاں کو پہنچادو تو توقع یہی کی جائے گی آپ وہی چیز منزل مقصود تک پہنچادیں گے۔ آج کل ہمارے ڈاک خانوں سے منی آرڈر بھیجا جاتا ہے۔ ایک رقم آپ ڈاک خانے کے سپرد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس امانت کو تم فلاں شخص تک پہنچادو۔ جو رقم آپ ڈاک خانے کے سپرد کرتے ہیں، امانت کا عام اصول تو یہی ہے کہ وہی رقم پہنچائی جائے۔ لیکن ڈاک کے موجود نظام کے مطابق آپ کی رقم سرکاری خزانے میں جمع ہو جاتی ہے اور منی آرڈر وصول کرنے والے کو متبادل رقم ادا کر دی جاتی ہے۔ اصل رقم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ یہی استحسان کا مفہوم ہے۔ اگر چہ یہ طریقہ امانت کے قانون کی ابتدائی یا سطحی مفہوم سے کسی حد تک مختلف ہے لیکن اس طریقے سے امانت کا حق ادا کرنے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے، اور اصلی اور متبادل رقموں کا مالیت میں کوئی فرق بالکل نہیں ہوتا۔ اس مختصر تشریح کا منشا اصل میں یہ تھا کہ مسلمانوں نے علمِ قانون کو اپنے اجتہادِ فکر کی بدولت اس طرح مدون کیا کہ اسلامی قانون کو اس کے قانون ساز رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی وفات کے بعد آپکی غیر موجودگی کے باعث کوئی دشواری پیش نہ آئی اور آج بھی اسلامی قانون اسی اصول کی وجہ سے اپنی جگہ محفوظ اور ہر دور میں قابل عمل ہے۔ ایک نکتہ بیان کر کے میں اس لیکچر کو ختم کرتا ہوں۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی قانون کو یا تو خود قانون ساز بدل سکتا ہے یا اس سے بالاتر شخصیت۔ اس سے کمتر شخصیت کو قانون بدلنے کی اجازت نہیں۔ اگر اللہ نے کوئی حکم دیا تو اللہ ہی اسکو بدل سکتا ہے۔ اسی طرح نبی کے حکم کو یا خود وہی نبی بدلے گا یا اللہ اور یا اللہ کا بھیجا ہوا کوئی دوسرا نبی۔ نبی سے فروتر شخص مثلاً کوئی فقیہ اسے نہیں بدل سکتا۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون کے جو احکام قرآن میں ہیں انھیں کوئی اور شخص نہیں بدل سکتا لیکن ایک فقیہ کی رائے دوسرا فقیہ رد کر سکتا ہے اور اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔ جیسا کہ میں گزشتہ لیکچر میں بیان کیا تھا۔ کہ یہ چیز انفرادی قیاس ورائے اور استنباط ہی سے متعلق نہیں بلکہ اجتماعی رائے کے متعلق بھی درست ہے۔ کم از کم حنفی مذہب میں یہ بات قبول کر لی گئی ہے کہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک چیز پر اجماع پایا جاتا ہے۔ اجماع کے سامنے ہم سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے خلاف زبان نہ کھولے۔ اگر کوئی شخص جرات کر کے ادب کے ساتھ، دلیلوں کے ساتھ، اس کے خلاف اپنی رائے پیش کرے اور پھر اس نئی رائے کو دوسرے فقہاء بھی قبول کریں تو ایک

نیا اجماع ہو جاتا ہے۔ یہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر دیتا ہے۔ یہ اصول مشہور حنفی امام ابو الیسر البزدوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "اصول الفقہ" میں بیان کیا ہے۔ امام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی اور پانچویں صدی کے درمیان کے فقیہ گزرے ہیں۔ اسلامی قانون میں ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کے اس بیان کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجماع ہمارے لیے مصیبت کا باعث نہیں بن سکتا۔ اجماع اگر کسی نامناسب چیز پر ہو گیا اور حالات کے بدلنے کی وجہ سے ہم ان پر عمل نہ کر سکتے ہوں تو اس کی گنجائش ہے کہ اجماع کے بدلنے کا بھی ہم سامان پیدا کر لیں اور قیاس کے ذریعے سے ایک نیا اجماع پیدا کر کے پرانے اجماع کو بدل دیں۔

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ،

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سوالات وجوابات

برادران کرام!خواہران محترم!السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ!

متعدد سوالات آئے ہیں،اپنی بساط کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال نمبر1: موجودہ دور میں پاکستان میں اجتہاد کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟اسکی وضاحت فرمائیں۔اسی طرح اس دور میں اجماع اور قیاس کا کیا طریقہ ہوگا؟

جواب:- میرا خیال ہے کہ پاکستان اور غیر پاکستان کا سوال بے محل ہے۔ساری دنیا کے مسلمانوں کا یہ مشترکہ معاملہ ہے۔جس چیز کے متعلق قرآن وحدیث میں صراحت نہیں ہے اورایک ایسامسئلہ پیدا ہوا ہے جسکی ہمیں ضرورت ہے تواس کے لیے ہم اجتہاد کے ذریعے سے اسلامی نقطہ نظر معلوم کرنے کی کوشش،انفرادی طورپر بھی کریں اورباہمی مشاورت سے بھی یعنی اجتماعی طورپر بھی۔سب لوگ متفق ہوتے ہیں۔توفبہاورنہ ہماری حکومت کوجورائے اپنے پارلیمنٹ کے ارکان کی کثرت رائے کی بنیادپر مناسب معلوم ہوگی،اس پر عمل کرایاجائے گا۔اجماع اور قیاس کا ابھی یہاں ذکر کیاگیاہے۔اصل چیز صرف اجتہاد ہے۔کچھ خفیف سے فرق کی وجہ سے اس کے مختلف نام ہوگئے ہیں۔کس طرح اجتہاد قیاس کہلائے گا،کس طرح اجتہاداستحسان کہلائے گا،یہاں مجھے تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔قیاس اوراجماع عملاً ایک ہی چیز ہیں۔صرف اتناہی فرق ہے کہ اجتہادایک آدمی کی رائے ہوتی ہے اوراجماع وہ ہے جس پر سارے فقیہ اور قانون کے ماہرین متفق ہوجائیں۔میں غالباکسی لیکچر میں عرض کرچکاہوں کہ مسلمانوں میں اجماع کاتصور پایاجاتاہے لیکن بدقسمتی سے گزشتہ چودہ سوسال سے اجماع کوایک ادارے کی حیثیت دینے کی طرف ہم نے توجہ نہیں کی۔نتیجہ یہ ہے کہ کسی چیز پراجماع ہواہے یانہیں،اس کے معلوم کرنے کاآج ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں،ابتدائی صدیوں ہی سے مسلمان تین براعظموں ایشیاء،یورپ اورافریقہ میں پھیلے ہوئے تھے مگر کبھی یہ صورت ممکن نہ ہوسکی کہ کسی سوال کوسارے

فقہاء کے پاس بھیج کر ان کی آراء کو جمع کیا جاتا، کیا سب لوگ اس جواب پر متفق ہیں؟ شاید پرانے زمانے میں یہ چیز ممکن بھی نہیں تھی، کیونکہ وسائل نقل وحمل کی دشواریاں تھیں۔ لیکن زمانہ حال میں اسکے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔اسی لیے میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اسلامی ممالک تک اپنے آپکو محدود رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں بھی مسلمان موجود ہیں، انکو ایک نظام کے اندر منظم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ مثلاہر ملک میں انجمن فقہاء قائم کی جائے۔کسی مقام پر اس کا ایک صدر مرکز ہو۔ یہ مرکز پاکستان میں بھی ہوسکتاہے اور پاکستان سے باہر بھی، حتی کے ماسکو اور وشنگٹن میں بھی ہوسکتاہے۔اس میں کوئی امر مانع نہیں کیونکہ یہ صرف مسلمانوں کا ایک مخصوص ادارہ ہوگا۔جہاں بھی مرکز ہو اس کو ایک سوال پیش کیا جائے گا۔اگر سیکرٹریٹ کی رائے میں وہ سوال واقعی اسکا متقاضی ہو کہ مسلمان فقہائے عالم اپنی رائے دیں، تو وہ اس سوال کو ساری شاخوں کے پاس روانہ کردے گا، اسلامی ممالک کی شاخوں کو بھی اور غیر اسلامی ممالک کی شاخوں کو بھی۔ ہر شاخ کے سیکرٹری اپنے ملک کے سارے مسلمان قانون دانوں کے پاس اس سوال کی نقل روانہ کرکے درخواست کرے گا کہ تم اپنا مدلل جواب اسکے متعلق روانہ کرو، جب اسکے پاس یہ جوابات جمع ہوجائیں تو وہ مرکز کو روانہ کرے گا، کہ یہ متفقہ جواب ہے۔اگر اختلافی جواب تو اختلاف کے ساتھ۔، لیکن ہر فریق کی دلیلوں کے ساتھ۔۔اس عملی پہلو پر بھی آپکو توجہ دلاؤں کہ مرکز کی زبان عربی ہونی چاہیے اور انفرادی طور پر ہر ملک میں کوئی مقامی زبان ہوسکتی ہے مثلا اگر وہ سوال پاکستان میں آئے تو یہاں کے علماء اپنے جوابات اردو میں دے سکتے ہیں یا کسی اور زبان میں۔ لیکن یہاں سے مرکز کو جو جواب جائے گا وہ عربی میں ہونا چاہیے تاکہ ساری دنیائے اسلام کے فقہاء اس سے آسانی سے استفادہ کرسکیں۔کیونکہ میری رائے میں ہم اچھا فقیہ اسکو کہیں گے جسے اچھی عربی آتی ہو غرض جب ساری شاخوں کے پاس سے جواب آجائے اور دیکھا جائے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے تو اس امر کا اعلان کیا جاسکتاہے کہ اس جواب پر سب لوگ متفق ہیں۔ لیکن اگر اختلاف ہو تو اختلافی دلیلوں کا ایک خلاصہ تیار کیا جائے اور دوبارہ اسکو گشت کرایا جائے تاکہ جن لوگوں کی پہلے ایک رائے تھی، ان کے سامنے مخالف دلیلیں بھی آجائیں۔اور انھیں غور کرنے کا موقع ملے، ممکن ہے وہ اپنی رائے بدل کر اس دوسری رائے پر متفق ہوجائیں جو انکے مخالفین کی تھی۔جب اسطرح سامنے مخالف دلیلیں بھی آجائیں۔اور انھیں غور کرنے کا موقع ملے، ممکن ہے اور اپنی رائے بدل کر اس دوسری رائے پر متفق ہوجائیں جو انکے مخالفین کی تھی۔جب اسطرح کافی غور وبحث کے بعد دوبارہ تمام شاخوں سے مرکز کے پاس جواب موصول ہوجائیں تو یہ معلوم ہوجائے گا کہ کس چیز پر اجماع ہوا ہے اور کس چیز پر اختلاف رائے ہے۔ نیز یہ کہ اختلافی پہلو پر اکثریت کی رائے کیا ہے؟ ان سب نتائج کو ایک رسالے کی صورت میں شائع کیا جائے جس میں جوابات مع دلائل درج ہوں۔ یہ میرا تصور ہے کہ ہمارے زمانے میں اجماع کو، اگر ہم ایک ادارہ بنانا چاہیں تو کس طرح بنائیں اور کس طرح اس سے استفادہ کریں۔ یہ قطعا ممکن نہیں

ہے کہ دنیا بھر کے ماہرین فقہائے اسلام کو مستقل طور پر کسی ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ وہ کسی چند روزہ اجتماع میں شرکت کے لیے تو آسکتے ہیں لیکن ساری عمر ایک مقام پر گزارنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان ملکوں کے لیے جہاں کے باشندے ہیں، فائدہ مند چیز ہو گی۔ کیونکہ انکے خدمات سے ان کے ہم وطن محروم ہو جائیں گے۔ اس کے بر خلاف اگر اس طرح کی انجمن بنائی جائے تو وہ اپنی رائے آسانی کے ساتھ دے سکتے ہیں۔ اور اس سے ساری دنیا کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارے فقہاء وصول شدہ خط کا جواب بھی دیں۔ بد قسمتی سے خط کا جواب دینے میں تساہل وتغافل اب ہم سے بہت عام ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی التاریخ الکبیر پڑھ رہا تھا، جو محدثین کے حالات کی کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ بخاری حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "خط کا جواب دینا اسی طرح واجب ہے جسطرح سلام کا جواب دینا"۔ اگر اس پر ہمارے زمانہ حال کے فقہاء عمل کرنا پسند کریں تو امت ان سے استفادہ کرے گی۔ ورنہ جہاں ہماری دیگر بے شمار برائیاں ہیں۔ ان میں یہ برائی بھی سخت ہے کہ لوگ کم ہی جواب دینا پسند فرماتے ہیں۔

سوال نمبر 2:- اسلامی قانون میں فیصلہ ظاہری عمل کی بنیاد پر دیا جاتا ہے، جس طرح جبری طلاق، ایسا کیوں ہے؟ نیت پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اسکی کیا وجہ ہے؟

جواب:- بظاہر اسکی وجہ یہ ہے کہ نیت ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی اور اسکا امکان بھی ہے کہ ایک آدمی ابتداء ایک نیت رکھتا ہے اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ جھوٹ بیان کرتا ہے کہ میری نیت یہ نہ تھی۔ ان حالات میں حدیث کے الفاظ کو اگر ہم دیکھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرار دیا ہے کہ ظاہر پر عمل کیا جائے، کیونکہ باطن کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن ایک جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قریبی صحابی حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ تعالی عنہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنی حضرت زید کے بیٹے بھی تھے انھوں نے ایک دشمن کا دست بدست مقابلہ کیا۔ آخری لمحے میں جب حضرت اسامہ رضی اللہ تعالی عنہ کی تلوار اسکے سر کے قریب پہنچ رہی تھی تو اس نے اشھد ان لا الہ الا اللہ بلند آواز سے کہہ دیا۔ اس کے باوجود حضرت اسامہ رضی اللہ تعالی عنہ نے ہاتھ نہیں روکا اور اس کا سر قلم کر دیا۔ جب اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خفا ہوئے۔ اسامہ نے کہا کہ اس شخص نے تو صرف ڈر کر کلمہ شہادت پڑھا تھا۔ حقیقت میں دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تھے: "ھلا شققت قلبہ"

(کیاتونے اسکادل چیر کر اسکے اندر دیکھا تھا کہ وہ ایسا تھا)۔دوسرے الفاظ میں ظاہر پر عمل کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔مغرب کی اعلی ترین ایجادوں کے باوجود انسان کے باطن کا حال معلوم کرنا اب تک ممکن نہیں ہو سکا۔اگر کسی دن یہ ممکن ہو جائے تو ہو سکتا ہے ہم اس پر عمل کریں، لیکن فی الحال اس پر عمل کرنا انصاف کے خلاف ہی ہو گا۔لوگ اپنے برے اعمال کے خمیازے سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا کریں گے اور اگر جھوٹ کو قانوناً ہمارا قاضی یا حاکم عدالت قبول کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ انصاف نہیں ہو گا، ظلم ہو گا۔

سوال نمبر3:- اگر نئے اجماع کو پرانے اجماع پر فوقیت دی جاسکتی ہے تو کیا یہ اصول صحابہ کے اجماع اور ائمہ اربعہ کے اجماع کو رد کرنے میں بھی قابل عمل ہو گا؟

جواب:- بجائے اصولی بحث کرنے کے میں یہ سوال کروں گا آپ کوئی ایسی چیز بتائیں جس پر صحابہ کا اجماع ہوا ہو، جس پر چاروں اماموں کا اجماع ہوا ہو، اور پھر میں آپکو جواب دوں گا کہ اس کے بدلنے کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔ فرضی سوالات میں وقت ضائع کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس پر سارے صحابہ متفق ہو چکے ہوں، جس پر سارے ائمہ حنفی، شافعی متفق ہوں، وہ قطعاً ایسی چیز نہیں ہو گی، جو آج ہماری عقلوں کے لیے ناقابل قبول ہو۔اسے اصولاً میں قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔آپ مجھے معین مثال دیں پھر میں بتا سکتا ہوں کہ اس قاعدے کے اطلاق، کہ نیا اجماع پرانے زمانے کے فقہاء کے سامنے پیش کریں گے۔جب تک ان کا اجماع نہ ہو، پرانا اجماع ہی واجب التعمیل ہو گا۔صحابہ کا اجماع یا ائمہ کا اجماع ہی برقرار رہے گا جب تک کسی مسئلے پر واقعتاً نیا اجماع عمل میں نہ آئے۔

سوال نمبر4:- اگر خلافت علی منہاج النبوۃ ہو تو وہ حکومت کس مسئلے میں اجتہاد کرے گی۔اگر کسی مسئلے میں اجتہاد کرے گی تو آیا عوام کے لیے قابل قبول ہو گا؟

جواب:- اگر ایسی خلافت ہو جیسی کہ آجکل ہے۔تو ظاہر ہے کہ حکومت کا اجتہاد قابل قبول نہ ہو گا۔اس صورت میں جو قرآن وحدیث سے خود استدلال نہ کر سکتا ہو کیا کرے گا۔کیونکہ آجکل بہت سے مسائل میں علمائے کرام نے مختلف آراء دی ہیں۔اگرچہ میں سوال کا مقصد شاید نہیں سمجھا لیکن ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا،وہ یہ کہ اسلام میں ایک روایت (Tradition) عجیب وغریب رہی ہے جو کسی اور قوم میں ہمیں نظر نہیں آتی۔یعنی اور ممالک میں قانون سازی حکومت

کا اجارہ ہوتی ہے، جب کہ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ چیز کبھی یوں نہیں رہی۔ اسلامی قانون کا یہ اصول ہے کہ عدالت کو حکومت سے آزاد رہنا چاہیے۔ یہ اصول مغرب میں بھی قبول کر لیا گیا ہے اور ہمارے ہاں بھی بر قرار اور جاری ہے۔ اسی طرح عہد نبوی کے بعد سے لے کر آج تک اسلام میں قانون سازی ایک پرائیویٹ چیز رہی ہے۔ کبھی حکومت کا اجارہ (Monopoly) نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان فقہاء پوری آزادی کے ساتھ۔ قانون کی ترقی میں مشغول رہے۔ قانون سازی صرف حکومت کی پارلیمنٹ تک محدود نہیں رہی، ورنہ اسلامی قانون کی ترقی اس طرح نہیں ہو سکتی تھی جس طرح عمل میں آئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کا یہ اصول، قانون اور حکم ہے بلکہ اسلامی روایت (Tradition) یہ ہے کہ قانون سازی حکومت کا اجارہ نہیں، ورنہ حکومت کی سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے قانون متاثر ہو گا۔ اگر میں وزیرِ قانون ہوں تو صدر مملکت کی ضرورت اور بعض وقت اسکی منشاء کا لحاظ کر کے مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش کروں گا اور اپنے اثرات ڈال کر، کہ میں اکثریتی پارٹی یا حکومتی پارٹی کا لیڈر رہوں، اپنے ارکان کو حکم دوں گا کہ اس مسودہ قانون کے خلاف رائے نہ دو۔ اس صورت میں اکثریت کی رائے سے جو قانون بنے گا وہ سیاسی ضروریات سے متاثر ہو گا۔ اسکے بر خلاف اگر مسلمان فقہاء کو حسبِ سابق آزادی رہے کہ قانون سازی وہ خود کریں یعنی احکام کے متعلق اپنے قیاس و اجتہاد کے ذریعے سے رائے دیں، تو وقتی سیاست اور حکومت کے احکام کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، ایک شخص اپنی رائے دے گا، دوسرا شخص اس کے برعکس رائے دے گا، تیسرا شخص شاید دونوں کے بین بین رائے دے گا اور اسطرح ایک عام بحث و مباحثہ کے بعد ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچ سکیں گے جو ملت کے لیے، حکومت کے لیے اور ساری انسانیت کے لیے کار آمد ہو سکتا ہے۔ میرا تصور اسکے متعلق یہ ہے۔ ضروری نہیں کہ اس رائے سے آپ بھی متفق ہوں۔

سوال نمبر 5:- امت مسلمہ میں سے پہلا اجماع کب ہوا اور کس بات پر ہوا؟

جواب:- مجھے معلوم نہیں۔ پہلا اجماع غالباً عہد صحابہ میں ہوا ہو گا۔ لیکن کس مسئلے پر اور کب ہوا تھا۔ یہ کہنا دشوار ہے۔ ممکن ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانے میں ہوا ہو۔ مثلاً زکوۃ نہ دینے والوں سے جنگ کے متعلق، کیونکہ یہ اولین مسئلہ تھا جس میں کچھ۔ اختلاف پیدا ہوا تھا۔ بڑے بڑے صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ جیسے صحابی کی بھی رائے تھی کہ فی الحال اس پر اصرار نہ کیا جائے اور جو لوگ صرف زکوۃ دینے سے انکار کرتے ہیں، انھیں کافر نہ قرار دیا جائے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کو جواب دیا کہ قرآن میں صلوۃ اور زکوۃ دونوں کو ایک ہی سانس میں بیان کیا گیا ہے۔ (اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ) جس طرح ایک شخص نماز پڑھنے سے انکار کرے تو میں مرتد قرار دینے پر مجبور ہوں۔ یہی

معاملہ زکوۃ کا بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پہلا اجماع ہو۔ یا شاید اس امر پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کو ایک خلیفے کی ضرورت ہے۔

سوال نمبر6:- کیا اجتہاد کا حق ہر شخص کو ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہر شخص کے اجتہادی اختلاف کی بناء پر اختلافات کی کثرت ہو جائے گی۔ اسکا حل کیا ہو سکتا ہے؟

جواب:- میں نے ابھی آپ سے گزارش کی کہ اجتہاد کا حق فنِ قانون اور اسلامی فقہ کے ماہرین کو ہو گا، ہر عام آدمی کو نہیں ہو گا۔ ان میں اختلاف رائے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس طرف اکثریت کی رائے ہے اور کس طرف اقلیت کی رائے ہے۔ اولا فرق ثانی یعنی مخالف کی دلیل کو معلوم کرنے کے بعد ہمیں موقع ملے گا کہ اسے قبول کریں یا رد کر دیں۔ اس میں میرے نزدیک کوئی دشواری نہ پرانے زمانے میں پیدا ہوئی اور نہ آئندہ زمانے میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ اختلاف رائے کی وجہ سے فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اختلاف نیک نیتی سے کیا جائے، صرف اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے نہیں یا اس لیے نہیں کہ فلاں نے یہ بیان کیا ہے۔ لہذا میں اسکی تردید ضرور کروں۔ غالباً اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف رائے کو روکنا نہیں چاہیے۔ اسے صحیح رخ میں صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کرنا مفید ہو گا۔

سوال نمبر7:- اگر ایک غیر مسلم آپ سے یہ کہے کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ براہ کرم آپ مجھے وہ فرقہ بتا دیں جس کے عقائد و نظریات پر عمل پیرا ہو کر وہ صحیح مسلمان بن سکے گا۔ نیز اس بارے میں آپ ذاتی طور پر اسے کیسے مطمئن کریں گے؟ شکریہ۔

جواب:- میں سمجھتا ہوں کہ اسکا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی فرقے کے اندر یا مذہب کے اندر ہے تو پورے خلوص اور پورے یقین کے ساتھ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسکا یہی مذہب ٹھیک ہے۔ لہذا اس کے پاس آنے والے طالبعلم کو بغیر اصرار کے اس پر چلانے کی کوشش کرے گا۔ میرا اپنا طرز عمل اس بارے میں کچھ مذبذب سا رہا ہے۔ پیرس میں بعض نو مسلم فرانسیسی مجھ سے پوچھتے رہے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ مسلمانوں میں بہت سے فقہی مذاہب (School of Law) ہیں، حنفی شافعی، مالکی، ہم کسے اختیار کریں۔ مالکی مذہب میرا مذہب نہیں ہے۔ لیکن فرانس میں شاید اسی پچاسی (80،85) فیصد یا اس کے سے بھی زیادہ لوگ مالکی مذہب کے ہیں۔ لہذا میں ان سے کہتا ہوں کہ مالکی مذہب تمہارے ماحول کے لیے موزوں تر ہے۔ میں خود مالکی مذہب کا نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس ماحول میں جذب ہونے کے لیے مالکی مذہب کے رہو تو یہ زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ میرا طرز عمل رہا ہے۔ اس

بارے میں آپکو اختیار ہے آپ جس طرح چاہیں عمل کریں اور ظاہر ہے کہ آپ اسی مذہب کی طرف اس نومسلم کو بلائیں گے جو آپ کی رائے میں صحیح ہوگا۔

سوال نمبر8:- اگر وہ شرعی دلیلوں میں تعارض پیدا ہو جائے تو مجتہد کو کس طرف رجوع کرنا چاہیے اور کیوں؟

جواب:- یہ مجتہد خود فیصلہ کرے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ اس کے سامنے دو دلیلیں ہوں تو اسکی رائے اسکا ذہن اور اسکا ضمیر جس چیز کی طرف مائل ہوگا۔ وہ اسی کا حکم دے گا۔ کوئی قاعدہ نہیں ہے بلکہ یہ انفرادی چیز ہوگی۔ محض سہولت ہمیشہ بہتر اور مفید چیز نہیں ہوتی۔

سوال نمبر9:- مجتہد کے استنباطی احکام کے لیے کون سا طریقہ کار ہے؟

جواب:- اس کے لیے آپ اصولِ فقہ کی کسی کتاب کو آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اجتہاد کی بحث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کو کسی مسئلے کا حکم دینے کے لیے سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ قرآن میں وہ چیز نہ ملے تو حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حدیث میں نہ ملے تو اس سے پہلے کے جو فقہاء اور مجتہد گزرے ہیں، یعنی جہاں ان میں اجماع پایا جاتا ہے تو اسکی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور ان میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو ذہن سے سوچ کر ایسا حکم دینا چاہیے جو اس حکم دینے والے کی رائے میں سب سے زیادہ قابل قبول ہو۔ یعنی خدا ترسی کے ساتھ۔ اس کو حکم نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ چونکہ فلاں صاحب مجھے بطور وکیل کے فیس دے رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی مرضی کے مطابق میں قانون وضع کر دوں۔ وکیل بے شک کوشش کرے گا کہ اسکا مؤکل مقدمہ جیت جائے۔ لیکن اگر اس سے اس کی پرائیویٹ حیثیت سے کوئی سوال کیا جائے وہ ایسا نہیں کرتا۔ وہ ایسی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو اس کی رائے میں حق کے مطابق ہے اور خدا کی قبولیت کا امکان رکھتی ہے۔

سوال نمبر10:- امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کی تدوین کے سلسلے میں ایک شہادت کو بھی قبول کرنے پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اسلامی قانون شہادت اکثر صورتوں میں واحد شہادت کو قبول نہیں کرتا۔ یہ تضاد کیسے حل کیا گیا ہے؟

جواب:- میرے خیال میں اسکا جواب یہ ہے کہ قاضی کے سامنے اگر ایک مقدمے کے فیصلے کے سلسلے میں کوئی مسئلہ آئے تو وہ گواہیاں طلب کرے گا۔ لیکن حدیثوں کا مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ اگر ایک ثقہ راوی کے ذریعے سے کوئی حدیث ہم کو پہنچ چکی ہے یعنی

خبر واحد ہے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اسے قبول کرو۔ مگر اس بارے میں کہ عدالت کے سامنے کوئی دعوی پیش کیا جائے تو اکثر صورتوں میں اس کی دو گواہوں کی ضرورت ہو گی لیکن بعض صورتوں میں ایک گواہی بھی کافی ہوتی ہے۔ مثلاً بچے کی پیدائش کے بارے میں صرف دائی کا بیان کہ یہ بچہ اس عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے کافی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس موقع پر دوسرے لوگ موجود نہیں ہوتے۔ لیکن زنا کے مقدموں میں چار گواہوں کی ضرورت قرآن نے قرار دی ہے تو وہاں دو نہیں بلکہ چار کی ضرورت ہو گی۔ کہنا یہ ہے کہ حدیث کو قبول کرنا ایک الگ چیز ہے اور مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت کسی گواہی کو قبول کرنا ایک دوسری چیز ہے۔ معتزلہ فرقے میں خاص کر اسکے ایک مشہور امام "نظام" کا خیال تھا کہ اس حدیث کو ہم قبول نہ کریں جسے دو راویوں کے ذریعے ہم تک نہ پہنچایا گیا ہو۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جواب مجھے معقول نظر آتا ہے کہ عہد نبوی میں ایسا نہیں کیا جاتا رہا۔ لہذا ہمیں ضرورت نہیں کہ اس قدر اصرار کریں، ورنہ نتیجہ یہ ہو گا کہ حدیثوں کی بہت بڑی تعداد سے ہم محروم ہو جائیں گے اور یہ ہمارے لئے علمی اور دینی نقصان ہو گا۔ یہ کوئی تضاد نہیں ہے جس کے حل کرنے کی ضرورت ہو۔ حدیث کو ایک راوی کی بنیاد پر قبول کیا جائے۔ لیکن دعوے کو عدالت میں دو گواہوں کی بنا پر قبول کیا جائے۔

سوال نمبر 11:- کیا شارع کی منشا کے بغیر یا خلاف، احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً جنگ قادسیہ میں سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شراب (خمر) پر معاف کر دینا یا حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی کی شکایت پر حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کو قطع ید کا حکم سنا کر منسوخ کر دینا۔

جواب:- پہلے سوال کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ انتہائی خصوصی حالات میں ایسا بھی عمل میں آیا ہے کہ کسی قانون کا اطلاق نہ کیا گیا ہو یا ملتوی کیا گیا ہو۔ چنانچہ جنگ قادسیہ میں ایک سپاہی نے، جسے شراب نوشی کے الزام میں درے لگانے کی بجائے عارضی طور پر قید کر دیا گیا تھا، اس قید سے عارضی مدت کے لیے چھٹی لی اور جا کر ایسی بہادری سے لڑا کہ اس جنگ کی کایا پلٹ گئی۔ اس سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔ جب سعد بن ابی وقاص نے اسے کہا کہ جاؤ میں تمہیں معاف کرتا ہوں تو ابو محجن ثقفی کو بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اگر مجھے درے لگا دیے جاتے تو اللہ کے ہاں معاف ہو جاتا۔ مجھے اللہ کے سامنے جواب دہی کے لیے تیار ہونا ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ شراب نہیں پیئوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سعد بن ابی وقاص کی فراست تھی کہ اس شخص کے ضمیر کو بیدار کرنا چاہیے اور وہ تدبیر یہ ہے کہ اسکو معاف کر دیا جائے۔ ممکن ہے ان صحابہ کے متعلق اور صورتوں میں بھی ایسے ہی واقعات پیش آئے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ یہ وہ شخص ہے کہ جب وہ کسی راستے

پر چلتا ہے تو شیطان کو ادھر سے گزرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ان میں اتنی بے نفسی Selflessness پیدا ہو گئی تھی کہ کبھی ذاتی خواہش کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔وہ اللہ ،رسول اور اسلام کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ ایک زمانے میں جب قحط پڑا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اس زمانے میں قحط کے دوران غذائی اجناس کی چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹنا بالکل ہی بند کر دیا یہ انکا اجتہاد تھا۔اس بارے میں ممکن ہے کہ کسی کو منطق اور اصول کی بنا پر اختلاف ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر منطق والے صاحب اس زمانے میں بر سر اقتدار اور خلیفہ ہوتے تو وہ بھی وہی کرتے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے کیا تھا۔میرا خیال ہے۔میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس جواب سے آپ کو اتفاق ہو گا یا نہیں۔

سوال نمبر12:- فقہ اسلامی کے ضمنی ماخذ استحسان، مصالح اور عرف کو مختصر توضیح کیجئے۔

جواب:- استحسان سے مراد یہ ہوتا ہے کہ فوری طور پر جو ظاہری مفہوم ذہن میں آتا ہے،اسکی جگہ اسکی عمیق تر وجہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے،اسکو استحسان کہا گیا ہے۔فوری ذہن میں آنے والی چیز پر نہیں بلکہ اس عمیق تر چیز پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے،یہ استحسان کہلاتا ہے۔مصالح مرسلہ بھی عملاً وہی چیز ہے۔اس چیز میں مفاد عامہ کی مصلحت پیش نظر ہوتی ہے،کہ ایسا ہے تو منطق پر عمل کرنے کی جگہ امت کی مصلحت،سہولت آسانی اور ملک میں امن وامان کو بر قرار رکھنے کی کوشش کرنا بہتر ہے،مصالح مرسلہ کہلاتے ہیں۔عرف کے معنی میں بتا چکا ہوں کہ ملک کے رسم ورواج کو کہتے ہیں۔اسے کس نے بنایا،کب بنایا ہمیں کوئی علم نہیں۔جس کو قانون نے منسوخ نہیں کیا۔وہ عرف رہتا ہے اور بر قرار رہتا ہے۔یہ عرف ہر ملک ہو گا۔چاہے ہندوستان یا پاکستان کا ہو۔عرب کے قبیلوں کا ہو،چین کا ہو،افریقہ کا ہو،جہاں بھی ہم جائیں اور کوئی نیا طرز عمل کسی چیز کے متعلق نظر آئے جو قرآن وحدیث سے نے منسوخ نہیں کیا تھا تو اسے ہم قبول کر سکیں گے۔اگر وہ ہمارے رائے میں معقول بھی ہو۔

سوال نمبر13:- کیا یہ درست ہے کہ عراق میں ذخیرہ حدیث بہت کم پہنچا،اس لیے امام حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قیاس سے فقہی مسائل استنباط کیے اور اس میں اہل عجم کے مزاج کی خوب رعایت کی،اس لیے اسے قبول عام حاصل ہوا؟

جواب:- میں اس خیال کے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی ابتدائی زمانے کے فقیہ ہیں۔ان کی ولادت 80ھ میں ہوئی تھی۔جو کوشش عہدِ نبوی سے اس وقت تک حدیث کو مدون کرنے کے لیے شروع ہوئی تھی،ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچی تھی اور جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے وہ متخصص لوگوں (Specialists) کا کام تھا۔کچھ۔لوگ حدیث سے دلچسپی رکھتے

تھے اور کچھ لوگ فقہ سے اور ابھی تک ایسی کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں، جیسے بخاری، مسلم، حدیث کی کتابیں ہیں انکو ایک فقیہ بھی آسانی سے حاصل کر کے پڑھے۔ اگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقہ کے کام کو چھوڑ کر حدیث کی تلاش میں لگ تو انھیں ساری عمر گزارنا پڑتی اور فقہ کا علم ان کی قانونی صلاحیت سے محروم ہو جاتا۔ عراق میں احادیث پہنچ چکی تھیں۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض صورتوں میں حدیث نہ ہونے کی بنا پر اجتہاد کر کے ایک رائے دی۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فوراً ہی بعد یعنی پچاس ساٹھ سال کے اندر حدیث کے ذخیرے فقہاء کی دسترس میں بھی آ گئے۔ حنفی مذہب ہی کے فقہاء نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے خلاف رائے دی اور وہ حنفی مذہب کا جز بن گئی۔ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ بہت سی صورتوں میں صاحبین کی رائے پر عمل کیا جاتا ہے، ابو حنیفہ کی رائے پر عمل نہیں کیا جاتا، لیکن اسے حنفی مذہب ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایک زمانے میں فقہیوں کو حدیثوں کا علم کم تھا، لیکن انھوں نے حدیثوں سے انکار بالکل نہیں کیا تھا۔ یہ کہنا کہ یہ عجمیت اور ایرانیت کی بنا پر تھا، میری رائے میں قطعاً غلط ہے۔

سوال نمبر 14:- آپ نے فرمایا کہ قانون بدلنے والا یا تو خود قانون ساز ہو یا اس سے بالاتر شخصیت حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے قحط کے دور میں چوری کے لیے قطع ید کی سزا ملتوی کر دی جب کہ نہ تو وہ مقنن تھے، نہ وہ پیغمبر۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب:- میں سمجھتا ہوں انھوں نے قرآن مجید کی اس آیت (الا من اضطر) (173:2) سے استدلال کیا ہے۔ اگر اضطرار کی حالت پیدا ہو جائے تو جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات" حالتِ اضطرار میں ممنوعات بھی مباح ہو جاتے ہیں، یا (Necessity know no Law) ضرورت کسی قانون کی پرواہ نہیں کرتی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا خیال یہ تھا کہ چونکہ قحط کے زمانے میں حالت اضطرار کی کیفیت ہوتی ہے، لہٰذا اس قدر رعائت کی جائے اگر ایسا نہ کیا جاتا ممکن ہے بہت سے لوگ مر جاتے اور ان کے مرنے یعنی خود کشی کرنے کا وبال حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ پر پڑتا۔ ظاہر ہے ایک خدا ترس حکمران اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتا۔

سوال نمبر 15:- اجماع سے کیا مراد ہے، اجماع امت یا اجماع علماء؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی جس حدیث سے اجماع کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں تو اجماع امت کے لیے فرمایا گیا ہے کیا یہ اجماع ممکن ہے؟ کیونکہ مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں کون سا اجماع قانون بن سکے گا، اجماع اہلِ عراق یا اجماع اہلِ پاکستان؟

جواب:- میں سمجھتا ہوں کہ سوال کرنے والے دوست اگر میرے بیان سے واقف ہو چکتے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے بتایا کہ اجماع کو کسطرح منظم کیا جاسکتا ہے اور کسطرح Insitutionalize کیا جاسکتا ہے، تو سوال کا ایک جزء باقی نہ رہتا ہے۔ میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں کہ اجماع امت اور اجماع علماء میرے نزدیک ایک ہی چیز ہیں۔ اجماع امت سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر ان پڑھ شخص کی بھی رائے لی جائے بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ امت کے علماء کی رائے، جیسا کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے عرض کیا ہے کہ کسی شخص کو کسی خاص علم سے کوئی واقفیت اور لگاؤ نہیں ہے تو اسے مہم جو (Adventurer) بن کر اس علم میں دخل دینا، نہ اسکے لیے مناسب ہو گا اور نہ اس علم کے لیے سود مند ہو گا۔ لہذا اس سے مراد علماء ہی ہیں اور علماء میں بھی یہ شرط لگاؤں گا فقہاء کی، یعنی جس شخص کو علمِ قانون سے دلچسپی اور وقفیت ہے اور اس میں ایک حدتک خصوصی لگاؤ ہو اسی کو رائے دینے کا حق ہو گا۔ رائے دینے کے معنی یہ نہیں کہ رائے کو قبول بھی کیا جائے۔ وہ رائے دے گا، دوسرا شخص اس کے خلاف رائے دے گا۔ مثلاً میں نے رائے دی جو ناقص تھی، اسے آپ رد کرنے کی کوشش کی۔ اب تیسرا شخص فیصلہ کرے گا کہ میری رائے قبول کرے یا دوسرے شخص کی رائے۔ اس لیے میری رائے میں، رائے دینے میں کوئی ممانعت نہیں ہونی چاہیے بلکہ رائے قبول کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ فیصلہ کریں کہ کون سی رائے امت کے لیے اور اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی صلاحیت رکھنے والی ہے اور کونسی رائے نہیں۔

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ۔